ایم ذوالفقار علی رانا

عربوں کی قدیم داستان گوئی — سمر

لفظ "سمر" کی لغوی تحقیق

صاحب لسان العرب نے لکھا ہے کہ سَمَرَ یَسْمُرُ سَمْرًا و سُمُوْرًا کے معنی یہ ہیں کہ "وہ رات کو نہ سویا" اس میں اسم فاعل کا صیغہ سامِرٌ آتا ہے جس کی جمع سُمَّارٌ اور سَامِرَۃٌ ہے۔[۱]

سَامِرٌ اسم جمع بھی ہے۔ یعنی سُمَّارٌ کے معنی میں آتا ہے۔ سمر اور سامرۃ ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ یعنی رات کو جاگ کر آپس میں باتیں کرنا۔ اہلِ لغت نے کہا ہے کہ سامر اور سمّار ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو رات کے وقت آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ سمر خاص طور پر اُن باتوں کو بھی کہتے ہیں جو رات کے وقت کی جائیں۔ سمر اور سامر کا اطلاق ایسے لوگوں کی مجلس پر بھی ہوتا ہے، اور سامر کے معنی اس جگہ کے ہیں جہاں لوگ اکٹھے ہو کر رات کو باتیں کریں۔

رجُلٌ سِمّیرٌ کے معنی ہیں "وہ شخص جو رات کو باتیں سنائے"۔ السامر اسم جمع ہے۔ اس لیے قومٌ سامرٌ، سَمَرٌ، سُمّارٌ اور سُمَّرٌ ایک ہی معنی میں آتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

مُسْتَكْبِرِيْنَ ۖ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ۝[۲] (المومنون: ۶۷)

[یعنی تکبّر کرتے ہوئے، قرآن کے بارے میں افسانہ گھڑتے ہوئے اس کے متعلق بیہودہ باتیں کرتے ہیں]

۱۔ ابن منظور، لسان العرب ۴: ۳۷۶ - ۳۷۷

۲۔ راغب الاصفہانی کا خیال ہے کہ اس آیت میں سٰمِر واحد کا صیغہ ہے لیکن جمع کے صیغے کی جگہ استعمال ہوا ہے۔ (المفردات - ۲: ۱۷۵)

اس آیت میں سامراً، سُمّاراً کے معنی میں ہے۔ اَلسَّمَرَۃُ اس بات کو کہتے ہیں جو رات کے وقت سنائی جائے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مندرجہ بالا آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم قرآن مجید کو چھوڑ دیتے ہو اس حال میں کہ رات کو بات کرنے میں مشغول رہتے ہو۔

حدیث میں بھی یہ لفظ بار بار آیا ہے۔ چنانچہ ابن الاثیر نے لکھا کہ حدیث قیلہ میں ہے:

"اِذْ جَاءَ زَوْجُهَا مِنَ السَّامِرِ"[۳]

اس کی شرح ابن الاثیر نے یہ کی ہے کہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو آپس میں رات کو باتیں کریں۔ اسی طرح حدیث میں "السمر بعد العشاء" کی ممانعت آئی ہے۔ ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ یہ لفظ "م" کی فتح سے مسامرۃ کے معنی میں ہے جس کے معنی ہیں "رات کے وقت کی گئی بات"۔ اور بعض نے اسے "م" کے سکون سے بھی پڑھا ہے اور اسے صیغۂ مصدر قرار دیا ہے[۴]

اصمعی کا قول ہے: "السمر" اہلِ عرب کے نزدیک "ظلمت" (تاریکی) کے معنی آتا ہے۔ اصل میں رات کی تاریکی کے وقت عرب جمع ہو کر باہم باتیں کرتے تھے، پھر کثرتِ استعمال کی وجہ سے تاریکی کو "سمر" کہا جانے لگا۔[۵]

---

[۳] اس سے مراد قیلہ بنت مخرمہ التمیمیہ ہے جو صحابیہ ہے۔ اس نے رسولؐ اکرم کی خدمت میں اپنا واقعہ پیش کیا جس میں اپنی بہن کے بارے میں کہا: بینا أنا عندها ذات لیلة من اللیالی تحسب انی نائمة اذ جاء زوجها من السامر۔ یہ تمام واقعہ الاصابہ ابن حجر العسقلانی۔ ۴: ۳۸۰، ۳۸۱ میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ چونکہ اس میں قیلہ کا واقعہ مذکور ہے اس لیے محدثین نے اسے حدیث قیلہ کا نام دے دیا ہے۔ اس سے آنحضرتؐ کی اصطلاحی حدیث مراد نہیں۔

[۴] ابن الاثیر، النہایۃ فی غریب الحدیث ۲: ۱۹۵۔ الزبیدی، تاج العروس ۳: ۲۷۷۔

[۵] لسان العرب ۴: ۳۷۷۔

بعض اہلِ لغت نے لکھا ہے کہ دراصل "السمر" چاند کی روشنی کے رنگ کو کہتے ہیں۔ کیونکہ اہلِ عرب چاندنی میں باہم اکٹھے ہو کر باتیں کرتے تھے۔ چونکہ چاند کی روشنی کا رنگ گندمی ہوتا ہے اس لیے گندمی رنگ کی چیز کو "اسمر" کہتے ہیں۔

فرّاء نے لکھا ہے کہ عرب یوں بولتے ہیں: "لا افعل ذٰلك السمر والقمر"[۵۶] اس کی تشریح فرّاء نے یہ کی ہے کہ ہر وہ رات جس میں چاند طلوع نہ ہو سمر کہلاتی ہے، اس محاورے کے معنی یہ ہیں کہ خواہ چاند طلوع ہو یا نہ ہو۔

غرض لغت کی کتابوں میں السمر کی تشریح مندرجہ بالا الفاظ میں یا ان سے ملتے جلتے الفاظ میں کی گئی ہے۔ بہرصورت ادبی اصطلاح میں سمر اور مسامرۃ رات کے وقت اکٹھے ہو کر باتیں کرنے کو کہا جاتا ہے۔

جاہلی عربوں کے ہاں "سمر" اور "مسامرہ"

قرآن مجید کی مندرجہ بالا آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ عرب کے ہاں رات کو اکٹھے ہو کر آپس میں بات چیت کرنے اور تبادلۂ خیالات کا رواج تھا۔ اس کے علاوہ زمانۂ جاہلیت میں جب بنی جرہم اور بنی خزاعہ میں جنگ ہوئی اور بنی خزاعہ نے بنی جرہم سے خانہ کعبہ کی تولیت چھینی اور اس کے خود متولی بن گئے تو مضاض بن عمرو الجرہمی اپنے اونٹوں کی تلاش میں نکلا اور اس نے کوہ ابو قبیس پر چڑھ کر دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے اونٹوں کو پکڑ کر ذبح کیا اور کھایا جا رہا ہے۔ اس نے اس وقت کو یاد کرتے ہوئے جب وہ خود خانہ کعبہ کے متولی تھے چند شعر کہے جن میں کچھ شعر حسب ذیل ہیں:

کان لم یکن بین الحجون الی الصفا ۔۔۔ انیس ولم یسمر بمکۃ سامر
بلی نحن کنا اھلھا فازالنا ۔۔۔ صروف اللیالی والجدود العواثر
وبدلنا ربی دار غربۃ ۔۔۔ بھا الذیب یعوی والعدو المحاصر
فکنا ولاۃ البیت من بعد نابت ۔۔۔ نطوف بھذا البیت والخیر ظاھر[۵۷]

---

[۵۶] الراغب، المفردات ۱: ۱۷۵

[۵۷] الازرقی، اخبار مکۃ ص ۳۹ ۔ موسیٰ سلیمان، الادب القصصی عند العرب ص ۹۶ - ۹۸

ایسے معلوم ہوتا ہے کہ مقام حجون اور صفا کے درمیان کہیں کوئی انس کرنے والا ہم نشین نہیں تھا اور نہ مکّہ میں رات کو قصّہ گو قصّے سنایا کرتے تھے۔

کیوں نہیں بلکہ ہم وہاں کے باشندے تھے لیکن زمانے کی گردشوں نے اور بدقسمتی نے ہمیں وہاں سے نکال دیا۔

اللہ تعالیٰ نے مکّہ کی بجائے ہمیں اجنبی مقامات میں پہنچا دیا جہاں بھیڑیے چیختے چلاتے اور دشمن ہمارا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔

ہم نابت کے بعد بیت الحرام کے والی تھے اور اس کا طواف کیا کرتے تھے اور ہر قسم کی خیر و برکت کا ظہور ہوا کرتا تھا۔

قرآن مجید کی آیت، حدیث اور اشعار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں رات کے وقت اکٹھے ہو کر باہم باتیں کرنے اور قصّے وغیرہ سننے سنانے کا عام رواج تھا۔
سید محمود شکری الالوسی نے بھی کتاب بلوغ الارب میں اس رسم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

میلوں اور منڈیوں کے علاوہ عربوں کے ہاں کئی قسم کے اجتماع ہوتے تھے جن میں سے بعض صرف انس اور تفریح اور گزشتہ جنگوں اور واقعات کی یاد تازہ کرنے، شعر سنانے اور دیگر ایسے امور کے لیے ہوتے تھے جن سے طبعیت کو فرحت حاصل ہو، اور یہ حالت بالعموم رات کے وقت استراحت کے بعد اور اطمینانِ قلب کے ساتھ ہی حاصل ہو سکتی تھی جیسا کہ لفظ "مسامرۃ" سے معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ "سمر" رات کے وقت گفتگو اور باتیں کرنے کو کہتے ہیں۔ اہلِ عرب کی کیا بات ہے ان میں اس قدر دقیق غور و فکر پایا جاتا تھا کہ انسان کو حیرت ہوتی ہے، کیونکہ دن کا وقت بالخصوص صبح کا وقت دوڑ دھوپ کرنے، معاش کی تلاش، زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے، روزی کمانے اور اپنی حالت کو بہتر بنانے پر صرف ہوتا تھا۔ اس وقت میں وہ اپنی معاشی اصلاح کی طرف متوجہ ہوتے اور اسے کھیل کود، بے کار بیٹھنے اور گپّیں ہانکنے میں بسر نہ کرتے تھے۔
یہ صورت حال ہمارے زمانے کے بالکل برعکس ہے کیونکہ ہمارے لوگوں کو بُری عادتیں

پڑی ہوئی ہیں ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے عوام اپنا قیمتی وقت بیکار امور میں صرف کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ہر قسم کا کمال حاصل کرنے کے معاملے میں پیچھے رہ گئے ہیں، اور اچھے اخلاق اور اعلیٰ صفات سے محروم ہیں۔ جاہلی عربوں نے اپنے کارناموں اور قابلِ فخر باتوں سے دفتر بھر دیے تھے۔ جب وہ اکٹھے ہوتے تو مجلس کے ایک طرف حلقہ بنا لیتے تھے۔ حلقے کے درمیان وہ شخص بیٹھتا تھا جو سب سے زیادہ قابلِ عزت اور بزرگ ہوتا تھا۔ جب کوئی شخص کسی عجیب واقعہ یا بات کا ذکر کرنا چاہتا تو وہ اٹھ کر لوگوں کو اسی طرح سناتا جس طرح ایک خطیب خطبہ دیتا ہے اور جب کوئی شخص بات کرتا تو وہ تقریر کے دوران اپنی داڑھی کو چھوتا اور پھر گفتگو کرتے کرتے داڑھی کو مٹھی میں لے لیتا۔ یہ عربوں کی ایک رسم اور عادت تھی۔ اسی طرح باہم گفتگو کے دوران بھی ایک شخص دوسرے کی داڑھی پکڑ لیتا تھا۔ اُن کے خیال میں اسے ایک طرح کی باہمی مہربانی اور محبت خیال کیا جاتا تھا جیسا کہ خطابی نے شرح سنن میں بیان کیا ہے“ [۵۸]

صدرِ اسلام کا زمانہ

قرآن مجید کی مندرجہ بالا آیت اور حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کے زمانے میں بھی مسامرۃ کا رواج اہلِ عرب میں پایا جاتا تھا۔ قرآن مجید نے اس رواج کی بلاواسطہ مذمت نہیں کی بلکہ اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس مسامرۃ کے مقابلے میں قرآن مجید کی طرف توجہ کرنا بہتر اور اہم ہے۔ چونکہ اس وقت ادب کی تدوین اور کتابت کا عام رواج نہیں تھا، اس لیے اس زمانے کے مسامرین (افسانہ گو) لوگوں کے نام معلوم کرنا نہایت مشکل ہے، بعد میں مجالس مسامرۃ نے بھی مجالس ادب کی صورت اختیار کر لی۔ اسلام کے بعد جب لکھنے پڑھنے کا رواج عام ہو گیا تو عربوں کے ہاں جو قصص اور مسامرات متداول تھے اُن کو کتابی صورتوں میں جمع کیا جانے لگا چنانچہ ابن الندیم نے لکھا ہے:

”سب سے پہلی قوم جس نے فنِ مسامرۃ اور خرافات [۵۹] کو کتابی صورت میں جمع کر کے ان کی

---

[۵۸] بلوغ الارب ۱: ۲۷۰-۲۷۱

[۵۹] خرافہ بنی عذرہ کے ایک شخص کا نام تھا جسے جن اٹھا کر لے گئے تھے۔ اس نے وہاں جو کچھ

خزانوں میں جگہ دی، قدیم ایرانی لوگ ہیں جنھیں الفرس الاول کہا جاتا ہے۔ انھوں نے بعض قصے حیوانات کی زبان سے متعلق لکھے ہیں۔ پھر تیسرے طبقے کے ملوکِ ایران یعنی الاشغانیہ نے اس طرف بہت توجہ کی اور ساسانی حکمرانوں کے عہد میں تو یہ فن بہت وسیع ہوگیا۔ اہلِ عرب نے ان مسامرات کو عربی زبان میں منتقل کر دیا اور عربی کے فصیح و بلیغ علما نے ان میں کانٹ چھانٹ کر کے انھیں بہتر شکل میں پیش کیا۔

"علاوہ ازیں اس کے ساتھ ملتی جلتی چند کتابیں خود بھی تالیف کیں، اس فن پر فارسی میں لکھی گئی سب سے پہلی کتاب "ہزار افسانہ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کتاب کی تالیف کا سبب یہ تھا کہ ایرانی بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ کا یہ شیوہ تھا کہ وہ کسی عورت سے شادی کرتا اور اس کے ساتھ ایک رات بسر کر کے اگلے روز اسے قتل کر دیتا۔ ایک دفعہ اس نے ایک بادشاہ زادی سے شادی کی جو نہایت سمجھ اور عقل والی تھی۔ اس کا نام شہرزاد تھا۔ شبِ عروسی میں اس نے بادشاہ کو ایک قصہ سنایا۔ وہ ساری رات قصہ سناتی رہی جو اتنا لمبا تھا کہ رات ختم ہوگئی لیکن قصہ جو نہایت دلچسپ تھا جاری رہا۔ چنانچہ بادشاہ نے اسے قتل نہ کرنے کا عہد کر لیا۔ دوسری رات بادشاہ نے باقی قصہ ختم کرنے کی فرمائش کی۔ شہزادی قصہ سناتی رہی اور قصہ ابھی جاری ہی تھا کہ رات ختم ہوگئی۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ حتیٰ کہ ہزار راتیں گزر گئیں مگر قصہ ختم ہونے پر نہ آتا تھا۔ پھر اس کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا جسے دیکھ کر بادشاہ بہت خوش ہوا اور بادشاہ نے شہزادی کو قتل کرنے کا خیال ترک کر دیا۔[۱۰] فارسی کی "ہزار افسانہ" وہی کتاب ہے جس کا نام الف لیلۃ و لیلۃ ہے جس کا ذکر تفصیل سے بعد میں آئے گا۔

دیکھا، واپس آکر اس کے متعلق لوگوں کو باتیں سنایا کرتا تھا، لیکن لوگ اس کی باتوں کو جھٹلاتے اور کہتے کہ یہ خرافہ کی بات ہے پھر یہ ترکیب ہر ایسی بات پر بولی جانے لگی جو دلکش لیکن ناقابلِ یقین اور تعجب انگیز ہو۔ خرافات، خرافۃ کی جمع ہے اور اس کا مطلب احادیثِ خرافہ ہے۔ (ابن الاثیر، النہایۃ فی غریب الحدیث: ۲۵)

[۱۰] الفہرست ص ۴۳۶ - ۴۳۷

بنو اُمیہ کا دَور

بعض ادبی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی خلفا کے ہاں بھی مسامرۃ کا رواج تھا، چنانچہ المبرد نے اپنی کتاب الکامل کے باب الخوارج میں روح بن زنباع الجزامی کے بارے میں لکھا ہے:

وکان مسامرًا لعبد الملک بن مروان، اثیرًا عندہٗ [11]

یعنی روح، عبدالملک بن مروان کو رات کے وقت قصے کہانیاں سنایا کرتا تھا اور اس کے دربار میں اسے بہت قدرومنزلت حاصل تھی۔

بنو عباس کا دَور

اسی طرح المسعودی نے لکھا ہے:

ولم یکن احد من الخلفاء یحب مسامرۃ الرجال مثل ابی العباس السفاح [12]

یعنی کوئی خلیفہ لوگوں کے ساتھ رات کے وقت مذاکرہ کرنے کو ابو العباس سفاح سے زیادہ پسند کرنے والا نہیں تھا۔

چنانچہ المسعودی نے یزید رقاشی کے سفاح کے ساتھ چند مذاکرات کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے [13]

المسعودی نے اپنی کتاب میں احمد بن محمد العروضی (جو خلیفہ راضی باللہ کا مؤدب تھا) کے راضی باللہ کے ساتھ بھی دو مسامروں کا ذکر کیا ہے [14]

فن سمر و قصص کا عروج

ابن الندیم نے لکھا ہے:

---

[11] المبرد، الکامل ۲: ۱۲۲

[12] المسعودی، مروج الذہب ۳: ۲۷۸

[13] المسعودی، مروج الذہب ۳: ۲۸۵-۲۹۳

[14] نفس المکان ۴: ۲۲۸- ۲۲۹، ۳۳۲-۳۳۴

"اس بارے میں صحیح رائے یہ ہے کہ سب سے پہلا شخص جس نے رات کو افسانہ گوئی کی بنیاد رکھی "سکندر" تھا۔ چند لوگ اس کا دل بہلانے اور خوش کرنے کی خاطر اسے کہانیاں اور خرافات قصّے سنایا کرتے تھے۔ سکندر کا اس سے مقصد صرف لطف اندوز ہونا نہیں تھا بلکہ رات کے وقت اپنی حفاظت اور چوکیداری کے لیے بھی وہ ایسا کرتا تھا۔ سکندر کے بعد اس مقصد کے لیے اور بادشاہوں نے کتاب "ہزار افسانہ" سے یہی کام لینا شروع کر دیا جو ایک ہزار راتوں اور دو سو کے قریب افسانوں پر مشتمل ہے۔ کیونکہ ایک "سمر" (افسانہ) کئی راتوں میں ختم ہوتا تھا۔ میں نے یہ کتاب مکمل صورت میں کئی دفعہ دیکھی ہے اور در حقیقت یہ گھٹیا قسم کی بے معنی باتوں کا مجموعہ ہے"[۱۵]

ابن الندیم نے اس کے بعد لکھا ہے :

"ابو عبداللہ محمد بن عبدوس الجہشیاری مصنف کتاب الوزراء نے ایک کتاب لکھنی شروع کی تھی جس میں اہلِ عرب و عجم اور روم وغیرہ کے افسانوں میں سے ہزار چیدہ چیدہ افسانے جمع کیے۔ یہ افسانے ایک دوسرے سے الگ اور بے تعلق تھے، چنانچہ اس نے مسامر (قصّہ گو) لوگوں کو جمع کیا اور جو افسانے انھیں معلوم تھے اُن میں سے اچھے اچھے افسانے اکٹھے کر لیے۔ اس کے علاوہ قصے اور خرافات سے متعلق تصنیف شدہ کتابوں سے بھی اُس نے اپنے پسندیدہ افسانے چُنے، اور اس کام کا اُسے ملکہ حاصل تھا، چنانچہ اس طرح اس نے چار سو اسّی افسانے جمع کیے۔ ہر افسانہ ایک رات پر مشتمل تھا اور ہر افسانہ قریباً پچاس یا اس سے کم و بیش صفحات میں لکھا گیا۔ لیکن جیسا کہ جہشیاری کا ارادہ تھا وہ ہزار افسانے مکمل کرنے سے پہلے وفات پا گیا۔ اس مجموعے کے کچھ اجزا میں نے ابو الطیب الشافعی کے ہاتھ سے لکھے ہوئے دیکھے ہیں۔ جہشیاری سے پہلے بعض لوگ افسانوں کے علاوہ پرندوں اور چوپائیوں کی زبان سے بھی قصّے اور خرافات بیان کیا کرتے تھے۔ ایسے لوگوں میں سے یہ لوگ قابل ذکر ہیں : (۱) عبداللہ بن مقفع۔ (۲) سہل بن ہارون۔ (۳) علی بن داؤد

---

۱۵ الفہرست ص ۴۳۷

(جو زبیدہ کا کاتب تھا) وغیرہ"[۱۶]

ان تینوں ادیبوں نے میدانِ افسانہ گوئی میں جو کچھ کیا اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

عبداللہ بن مقفع

یہ شخص مخضرم الدولتین ہے اور اس نے ۱۴۳ھ میں ۳۶ سال کی عمر میں وفات پائی۔ یہ پہلے مجوسی تھا۔ پھر خلیفہ سفاح کے چچا عیسیٰ بن علی کے ہاتھ پہ ایمان لے آیا اور بعد میں خلیفہ منصور کا خاص مقرّب بن گیا۔ یہ نہ صرف ایک کاتب تھا بلکہ فصیح و بلیغ شاعر بھی تھا۔ اس کا نام ان لوگوں میں سرِفہرست ہے جنھوں نے دوسری زبانوں بالخصوص فارسی سے عربی میں کتابیں ترجمہ کیں۔ چنانچہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ کتاب کلیلہ و دمنہ ہے۔ یہ کتاب ایک ہندوستانی فلاسفر بیدپا کی تالیف ہے جو اس نے ایک ہندوستانی حکمران دبشلیم کے لیے جمع کی[۱۷] کہا جاتا ہے کہ یہ فتح سکندر کے بعد ہندوستان کا حاکم تھا لیکن بڑا ظالم اور سرکش تھا۔ بیدپا نے یہ کتاب اس کی ہدایت اور اصلاح کی خاطر لکھی اور قدیم زمانے کے ہندو برہمنوں کی عادت کے مطابق اس نے چوپایوں اور پرندوں کی زبان سے نصیحت کی باتیں کہلوائیں۔ اس کتاب میں بہت سی نصیحت آمیز اور اصلاحِ اخلاق سے متعلق اشارات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً: جھوٹے چغل خور کی باتیں سننے سے بچنا، بدفطرت آدمیوں کا انجامِ بد، دشمنوں کی چال سے ہوشیار رہنا، جلد بازی کی خرابی، احتیاط اور دُور اندیشی کا فائدہ، دشمن اور کینہ پرور لوگوں پر بھروسا نہ کرنا وغیرہ۔ یہ کتاب سب سے پہلے ہندوستان کی سنسکرت زبان میں بارہ ابواب میں ختم کی گئی۔ پھر اس کا سریانی زبان میں ترجمہ ہوا اور پھر پہلوی یعنی قدیم فارسی زبان میں ہوا۔ ابن مقفع نے اسی فارسی روایت کو عربی میں منتقل کیا اور اس کے شروع میں ایک مقدمہ لکھا جس میں اس کتاب کے مطالعہ کا شوق دلایا اور اس کے فائدے سے مطلع کیا۔ جب اس کتاب کی قدر و قیمت کا اہلِ عرب کو علم ہوا

---

[۱۶] الفہرست ص ۳۷۴

[۱۷] المسعودی، مروج الذہب ۱: ۸۰، حاجی خلیفہ، کشف الظنون ۲: ۱۵۰۷-۱۵۰۶

تو انھوں نے اسے بہت پسند کیا اور اسے ایک دوسرے سے روایت کرنے لگے۔ عربی کے بعض ادیبوں نے ابن مقفع کے اس کارنامے پر حسد کرتے ہوئے اسے دوبارہ عربی میں ترجمہ کیا اور بعض نے اسے آسان شعروں میں نظم کیا تاکہ لوگ اسے زبانی یاد کر سکیں۔ بعض اور ادیبوں نے اس کے مقابلے میں ایسی ہی کتابیں لکھنے کی کوشش کی لیکن ابن مقفع کے سوا کسی کی کوشش بارآور ثابت نہ ہوسکی اور ابن مقفع کا ترجمہ آج تک عام طور پر متداول اور موجود ہے، باقی لوگوں کے تراجم ضائع ہو چکے ہیں۔ مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ ابن مقفع کے ترجمے میں بھی کئی تغیرات رونما ہوگئے ہیں اور اب اس کتاب میں اکیس ابواب پائے جاتے ہیں جن میں سے بعض وہ ہیں جو اصل سنسکرت زبان میں تھے۔ ان ابواب کی تعداد بارہ ہے۔ تین ابواب فارسی ترجمے میں زائد کر دیے گئے ہیں۔ سنسکرت اور پہلوی زبان کے تراجم بھی دست بردِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکے اور اس کتاب کی عربی روایت کے سوا اور کوئی روایت باقی نہ رہی۔ اس روایت سے پھر مختلف لوگوں نے اسے مختلف زبانوں میں ترجمہ کرنا شروع کیا۔ چنانچہ اسے دوبارہ سریانی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ یونانی، اٹلی، جدید فارسی، ترکی، عبرانی، لاطینی، انگریزی، روسی اور اندلسی زبانوں میں اسے منتقل کیا گیا۔ فارسی میں اس کا سب سے مشہور ترجمہ انوار سہیلی کے نام سے اب بھی دست یاب ہے جو مُلا حسین بن علی کاشفی کی کوشش کا نتیجہ ہے[۱۸]۔

عربی میں یہ کتاب متعدد دفعہ چھپ چکی ہے۔ عربوں نے اس کے ساتھ اتنی دلچسپی ظاہر کی کہ اس کے مضامین کو شعروں میں نظم کر لیا۔ چنانچہ خلیفہ منصور اور مہدی کے درباری ادیب ابوسہل فضل بن نوبخت فارسی نے سب سے پہلے اس کتاب کو نظم کیا۔

حاجی خلیفہ نے لکھا ہے:

"عبداللہ بن ہلال الاہوازی نے خلیفہ مہدی کے زمانے میں اس کتاب کو یحییٰ بن خالد البرمکی کی خاطر عربی میں نقل کیا اور ابوسہل بن نوبخت نے اسے عربی نظم میں منتقل

---

[۱۸] حاجی خلیفہ، کشف الظنون ۲: ۱۵۰۹

کے یحییٰ سے ایک ہزار دینار انعام حاصل کیا۔ ابان بن عبدالحمید اللاحقی شاعر نے
ہی اس کو اشعار میں نظم کیا۔ اور بھی بہت سے لوگوں کے نام جنہوں نے اس کتاب کو نظم
یا تاریخ ادب میں مذکور ہیں۔ مثلاً: علی بن داؤد، ابن الصباریہ، ابن ممّاتی، عبدالمومن
بن الحسن، جلال الدین نقاش وغیرہ[19]

سہل بن ہارون نے خلیفہ مامون کے لیے کلیلہ و دمنہ کے مقابلے میں ایک
کتاب نظم میں لکھی جس کا نام "کتاب ثعلبہ و عفرۃ[20] تھا۔ یہ کتاب ضائع ہو چکی ہے۔[21]

سہل بن ہارون

یہ شخص دستیمسان کا رہنے والا تھا لیکن نقل مکانی کر کے بصرہ میں آگیا تھا۔ یہ خلیفہ
مامون کے دربار میں اس کے بیت الحکمت کا منتظم تھا۔ یہ ایک فصیح و بلیغ شاعر
اور خطیب تھا۔ جاحظ اس کی فصاحت و بلاغت کی بہت تعریف کرتا ہے بلکہ اس
کے طرزِ انشا کو بھی اس نے اپنا لیا ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اس نے کلیلہ و دمنہ
کی طرز پر کتاب ثعلبہ و عفرۃ لکھی لیکن وہ انقلابِ زمانہ کی نذر ہو گئی۔

علی بن داؤد

یہ زبیدہ بنت جعفر کا کاتب تھا اور نہایت بلیغ سمجھا جاتا تھا۔ اس کا اسلوبِ انشا
سہل بن ہارون کے اسلوب سے ملتا جلتا ہے۔ اس نے ادب میں کتاب الحرّۃ والامۃ
اور کتاب الظراف لکھی۔

مختلف اقوام کی کتبِ سمر

ابن الندیم نے لکھا ہے کہ فارسیوں، رومیوں اور ہندوستانیوں نے بہت سی کتابیں
سمر و خرافات میں لکھیں جن کی تفصیل اس نے اس طرح دی ہے۔

---

[19] نفس المکان ۲ : ۱۵۰۸

[20] المسعودی، مروج الذہب ۱ : ۸

[21] جرجی زیدان، تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ۲ : ۱۵۲-۱۵۵

کتبِ اہلِ فارس : کتاب ہزار داستان، کتاب خرافہ، کتاب الذئب والثعلب، کتاب نمرود ملک بابل، کتاب رستم و اسفندیار (اس کا عربی میں جبلہ بن سالم نے ترجمہ کیا)، کتاب سیرتِ نوشیرواں، کتاب بہرام و نرسی۔

کتبِ اہلِ ہند : کتاب کلیلہ ودمنہ (جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے)، کتاب سندباد الکبیر، کتاب سندباد الصغیر، کتاب ادب الہند والصین۔ کتاب الہند فی قصہ ہبوطِ آدمؑ۔ کتاب بیدپا فی الحکمۃ۔

کتبِ اہلِ روم : کتاب سمستہ ودمن۔ (یہ کلیلہ ودمنہ کی طرز پر ہے لیکن فصاحت وبلاغت کے درجے سے گری ہوئی ہے)۔ کتاب العقل والجمال، کتاب ادب روم، کتاب ملک بابل الصالح و ابلیس، کتاب نمرود ملک بابل، کتاب الشیخ والفتی، کتاب اردشیر ملک بابل و اربویہ و زبیرہ، کتاب الحکیم الناسک۔

عشاقِ عرب کی داستانیں

بہت سے عربی ادیبوں نے زمانۂ جاہلیت کے قصّے کتابی شکل میں لکھے۔ مثلاً عیسیٰ بن دأب، الشرقی بن القطامی، الہیثم بن عدی، ہشام الکلبی وغیرہ۔ اس قسم کے جو قصّے عربی زبان میں تالیف ہوئے، ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں :

کتاب عروہ وعفرا، کتاب جمیل وبثینہ، کتاب کثیّر وعزّہ، کتاب قیس ولبنیٰ، کتاب مجنون ولیلیٰ، کتاب توبہ ولیلیٰ، کتاب الصمۃ ابن عبداللہ وریّا، کتاب ابن الطثریہ وحوشیہ، کتاب وضاح الیمن وام البنین، کتاب سعد واسماء، کتاب مرّہ ولیلیٰ، کتاب ذی الرّمۃ ومیّۃ[۵۲۲]

ابن الندیم نے اس قسم کی کتابوں کی بہت لمبی فہرست دی ہے اور ان سب کو کتب السمر کے تحت درج کیا ہے۔

جرجی زیدان نے بھی الروایات والقصص کے زیرِ عنوان ایسی کتابوں کا ذکر کیا

---

۵۲۲ الفہرست ص ۴۳۶ - ۴۴۲

ہے اور لکھا ہے: جو قصّے ہم تک پہنچے ہیں اور مطبوعہ شکل میں دست یاب ہیں اُن میں سے چند ایک یہ ہیں: قصّہ عنترہ، الف لیلۃ و لیلۃ، قصّۃ ابی زید الہلالی، قصۃ الملک الظاہر اور قصہ فیروز شاہ وغیرہ۔ ان میں سے اکثر عباسی دور میں لکھے گئے۔

جرجی زیدان نے لکھا ہے کہ ہم ایسے قصّوں کو دو حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اول وہ جو عربوں نے خود وضع کیے۔ دوم وہ جو دوسری اقوام سے عربی میں نقل کیے یا اُن میں ترمیم و تنسیخ کی۔[۲۳]

عربوں کے طبع زاد قصّے

ایسے قصّوں میں زیادہ تر وہ قصّے شامل ہیں جو زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے کارناموں اور اُن کی معاشرتی حالت کے آئینہ دار ہیں مثلاً: حماسہ، وفا، شجاعت، عصبیت، جذبۂ انتقام اور حق ہمسایہ وغیرہ۔

عربوں کے یہ اوصاف تاریخی حقایق ہیں جو وہ ایک دوسرے سے نقل کرتے رہے ہیں۔ اسلام کے بعد یہ قصّے فوجیوں کے سامنے پڑھے جاتے تھے تاکہ جب وہ میدانِ جنگ اور فتوحات کے لیے جائیں تو ان کے جذبۂ شجاعت اور حمیّت کو جوش میں لایا جائے۔ اس مقصد کے لیے وہ عنترہ کے شعر بھی فوجوں کے سامنے پڑھتے تھے۔ تہذیب و تمدّن کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان تاریخی حقائق میں رومانی رنگ بھر دیے گئے اور ان واقعات کو افسانوی رنگ میں پیش کیا جانے لگا۔ اس طرح چھوٹے چھوٹے واقعات کی وسیع داستانیں بنتی چلی گئیں۔ ایسے قصّوں کی پہلے تو سینہ بسینہ روایت ہوتی چلی گئی اور پھر ان کو کتابی شکل میں لکھ لیا گیا۔ ان قصّوں کا اصل مقصد تاریخی واقعات کا بیان کرنا نہیں بلکہ جذبۂ شجاعت و حمیت کو برانگیختہ کرنا تھا۔ چنانچہ قصّے کا راوی موقع و محل کے مطابق واقعات میں ایسی چیزوں کا اضافہ کر دیتا جس سے خواہ مخواہ جوش اور شجاعت کو انگیخت ملتی۔ ان قصّوں کی نسبت بعض مشہور راویوں کی طرف کر دی جاتی مثلاً: اصمعی اور ابو عبیدہ وغیرہ تاکہ مستند سمجھے جائیں۔ یہ فن

۲۳۔ جرجی زیدان، تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ- ۱: ۱۲۹: ۱۳۰

عباسی دَور میں بہت ترقی کر گیا اور عباسیوں کے آخری عہد میں نہایت عروج پر پہنچ گیا۔ بعض قصّے حقیقت سے قریب اور بعض بہت دُور ہو گئے۔ اُن میں سے بعض گھروں اور مجالس میں وقت گزارنے اور دل بہلانے کی خاطر بھی پڑھے جانے لگے۔ ایسے قصّوں کی چند مثالیں حسب ذیل ہیں:

قصّۂ عنتر

یہ وہ قصّہ ہے جو اہلِ عرب کے قصصِ حماسیہ میں سب سے اہم سمجھا جاتا ہے۔ در اصل یہ قصّہ لگاتار بہت سے قصّوں کا مجموعہ ہے جن سب کی کڑیاں آپس میں ملی ہوئی ہیں۔ یہ قصّہ زمانۂ جاہلیت کے آداب، اس زمانے کے لوگوں کے اخلاق و عادات اور جنگوں کا پوری طرح آئینہ دار ہے۔ اس قصّے میں جو نام آتے ہیں وہ زیادہ تر تاریخی شخصیتیں ہیں لیکن انھیں افسانوی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ اس قصّے میں مبالغے کا رنگ صاف طور پر نظر آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قصّہ چوتھی صدی ہجری میں وضع کیا گیا۔ اس کے واضع کا نام یوسف بن اسمٰعیل بتایا جاتا ہے جو مصر کے فاطمی خلیفہ عزیز باللہ کے زمانے میں تھا۔ یوسف نے یہ قصّہ ایک ہی دفعہ وضع نہیں کیا بلکہ آہستہ آہستہ یہ پایۂ تکمیل تک پہنچا، یعنی جوں جوں وقت گزرتا گیا اس میں ترمیم و تنسیخ ہوتی رہی۔ حتیٰ کہ اپنی موجودہ صورت میں ہم تک پہنچا۔ یہ قصہ ابتدائی زمانۂ اسلام میں جنگجوؤں اور بہادروں کو شجاعت دلانے کی خاطر اُن کے سامنے پڑھا جاتا تھا۔

چنانچہ طبری اور ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ حجاج بن یوسف کے زمانے یعنی ۷۷ھ میں عتاب بن ورقا کی شبیب بن یزید خارجی کے ساتھ جنگ کے موقع پر معرکہ شروع ہونے سے پہلے عتاب نے فوج کے میمنہ اور میسرہ اور سواروں اور پیادوں پر سالار مقرر کرنے کے بعد شمشیر زنوں، نیزہ بازوں اور تیر اندازوں میں فوج کو تقسیم کیا اور پھر لوگوں کو جنگ پر بھڑکانے اور گزشتہ بہادروں کے قصّے سنانے لگا۔ پھر اس نے کہا: قصّہ گو لوگ کہاں ہیں؟ لیکن کسی نے جواب نہ دیا۔ اس نے پھر پوچھا: عنترہ کے شعر روایت کرنے والا کوئی شخص موجود ہے؟ اس بات کا بھی کسی نے جواب نہ دیا۔ اس پر اس نے کہا: انا للہ!

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم عتاب بن ورقا کو چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے[۲۴]
جرجی زیدان نے لکھا ہے کہ پہلے جوش دلانے کے لیے عنترہ کے اشعار پڑھے جایا کرتے تھے، بعد میں عنترہ کے واقعات اور اس کے حالات اصمعی کی روایت سے ایک دوسرے سے نقل کیے جانے لگے۔ پھر ان واقعات کو یوسف بن اسمٰعیل نے کتابی شکل میں جمع کیا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ خلیفہ عزیز باللہ کے گھر میں ایک ناقابلِ ذکر واقعہ پیش آیا جس کا چرچا ہر گھر میں ہونے لگا اور خلیفہ کو یہ سخت ناگوار گزرا۔ اس نے یوسف بن اسمٰعیل سے جو اس کا درباری تھا، فرمائش کی کہ لوگوں کی توجہ اس واقعے کی طرف سے ہٹا کر کسی اور چیز کی طرف منعطف کی جائے۔ اس پر یوسف نے یہ قصہ جمع کر دیا۔ یوسف عربوں کے بہت سے واقعات اور نوادر کا راوی تھا۔ اس نے ابوعبیدہ، ابن ہشام، جہینہ اور اصمعی وغیرہ سے بہت سی روایات سن رکھی تھیں جن کی بنا پر اس نے یہ قصہ تحریر کیا تھا۔ اس کا ایک لطیف حیلہ یہ تھا کہ اس نے کتاب کو بہتر حصوں میں تقسیم کیا اور ہر حصے کو کسی ایسی بات پر ختم کیا جسے سن کر آگے کا واقعہ سننے کا خواہ مخواہ شوق پیدا ہو۔ اس طرح ہر حصے کو دوسرے حصے سے پیوند کر دیا گیا تاکہ پڑھنے اور سننے والا تمام کتاب کو ختم کیے بغیر نہ رہ سکے۔ کتاب میں جستہ جستہ مقامات پر عربوں کے اشعار بھی داخل کر دیے گئے تاکہ عبارت میں تنوّع پیدا ہو اور یہ مزید دلچسپی کا باعث بن سکے۔ لیکن افسوس ہے کہ بعض جاہل نقل کرنے والوں نے قصے کی روایت کو بگاڑ دیا ہے[۲۵]

یہ قصہ کئی ہزار صفحوں میں متعدد بار عربی میں چھپ چکا ہے، بلکہ یورپ کی بعض زبانوں میں بھی اس قصے کو کامل اور مختصر صورتوں میں نقل کر لیا گیا ہے۔

قصۃ البراق

عربی میں حماسہ اور جوش دلانے والے بعض قصے ایسے بھی ہیں جو وجود میں آنے کے بعد

---

[۲۴] الطبری، محمد بن جریر، تاریخ الرسل والملوک ۶: ۲۶۴۔ نیز دیکھیے ابن الاثیر، الکامل فی التاریخ ۔ ۴: ۔۔
[۲۵] جرجی زیدان، تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ۱: ۱۲۹-۱۳۰

نشو ونما پانے سے محروم رہ گئے کیونکہ انھیں جلد ہی کتابی صورتوں میں جمع کر دیا گیا۔ ایسے قصوں پر تاریخی واقعات کا رنگ غالب ہے اور انھیں ایک قسم کی تاریخ اور زمانۂ جاہلیت کی جنگوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ مثلاً عمر بن شبّہ (المتوفی ۲۶۶ھ) کا مجموعہ جو الجمہرہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مجموعہ بہت سے حوادث پر مشتمل ہے جو زیادہ تر بنی ربیعہ اور دوسرے قبائل سے متعلق ہیں۔ جیسا کہ قصۂ عنتر، بنی عبس اور دیگر قبائل سے متعلق ہے۔ ایک مطالعہ کرنے والا شخص اس مجموعے کو پڑھ کر ایسے محسوس کرتا ہے کہ وہ نیم تاریخی قصے ہیں جن میں ہیرو کا نام بُرّاق ہے جو بنی ربیعہ کا ایک قدیم شاعر اور مہلہل اور کلیب کا قریبی رشتے دار تھا۔ عنترہ کی طرح بُراق کے واقعات میں بھی شجاعت اور حماسے کا رنگ پایا جاتا ہے۔ اس کے عشق و محبت کی اس کے چچا کی لڑکی لیلی بن لُکیز کے ساتھ داستان مشہور ہے۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ براق کے قصّے میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا، لیکن اس کا حجم عنترہ کے قصّے کا مقابلہ نہیں کر سکا، اور وہ حقائق تاریخیہ کے زیادہ قریب ہے۔ یہ قصہ قصۂ عنترہ کی طرح قصۂ براق کے نام سے مشہور نہیں بلکہ عمر بن شبّہ نے اپنی کتاب الجمہرہ میں پانچ مسلسل قصّوں میں اس کے جنگی واقعات سمو دیے ہیں، جن میں سے آخری قصّہ حرب لبوس سے متعلق ہے۔ یہ قصّہ اپنی جگہ ایک مکمل داستان ہے جو سَو بڑے بڑے صفحوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کے ضمن میں قصّۂ عنتر سے ملتے جُلتے واقعات بھی آئے ہیں اور پڑھنے والے کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ قصۂ عنتر کا مطالعہ کر رہا ہے۔ فرق یہ ہے کہ قصۂ براق لغت کے لحاظ سے زیادہ صحیح ہے اور صدرِ اسلام کے زمانے کے طرزِ انشا سے زیادہ قریب اور حد سے بڑھے ہوتے مبالغے سے پاک ہے۔ اگر یہ قصّہ قصّۂ عنتر کی طرح کافی دیر تک زبانی روایت کیا جاتا رہتا تو غالباً یہ بھی قصۂ عنتر کی طرح ضخیم اور حقیقت سے زیادہ دور ہو جاتا، لیکن یہ قصّہ قصۂ عنتر سے ایک صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ پہلے کتابی صورت میں جمع کر دیا گیا۔ عمر بن شبّہ کی کتاب الجمہرہ کا قلمی نسخہ مصر کے مکتبۂ خدیویہ میں موجود ہے۔

قصۂ بکر و تغلب

اسی طرح کا ایک اور قصہ کتاب بکر و تغلب کے نام سے پایا جاتا ہے جس میں کلیب اور جساس کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ قصہ بعض ایسے واقعات پر مشتمل ہے جن کا ذکر عربوں کی تاریخ میں پایا جاتا ہے۔ مؤلف نے بعض قصائد اور واقعات کی تفصیل کا اضافہ بھی کیا ہے جو محض تخیل پر مبنی ہیں اور اس سے اہلِ عرب کے حماسہ اور بالخصوص بنی ربیعہ کی شجاعت کا بیان مقصود ہے۔ اس قصے کی روایت محمد بن اسحاق کی طرف منسوب ہے، یا ممکن ہے کہ مؤلف نے کچھ حصہ ابن اسحاق سے اخذ کرکے اپنی طرف سے اسے مکمل کیا ہو۔ یہ کتاب ۱۲۰ بڑے صفحات پر ۱۳۰۵ھ میں بمبئی میں طبع ہوئی تھی۔

قصہ شیبان مع کسریٰ نوشیروان

یہ ستر صفحے پر پھیلا ہوا ایک تاریخی قصہ ہے۔ کتاب بکر و تغلب کے ساتھ بمبئی میں طبع ہوا۔ یہ قصہ ایک خیالی داستان کے زیادہ قریب ہے اور یہ ایک تاریخی حادثے پر مبنی ہے جسے مؤلف نے اپنے تخیل کی بنا پر پھیلا دیا ہے۔ اس قصے میں شیبان اور کسریٰ نوشیروان کے درمیان جنگ کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ کسریٰ نے بنی شیبان کے ایک شخص نعمان سے اس کی بیٹی حرقہ بنت متجرّدہ کا رشتہ مانگا تھا، لیکن بنی شیبان نے غیرت کی بنا پر کسریٰ نوشیروان سے جنگ کا اعلان کر دیا۔ قصے کے واقعات میں کہیں کہیں عربی اشعار بھی آتے ہیں جو اپنے جدید العہد ہونے کا پتا دیتے ہیں۔ اس قصے کے افراد کے بعض اصل قصائد بھی قصے میں پائے جاتے ہیں۔

تاریخی واقعات کو اس طرح پھیلا کر بیان کرنا کہ وہ ایک داستان کی صورت اختیار کر لیں، اہلِ عرب کی اختراع نہیں بلکہ قدیم اقوام کا بھی یہ دستور تھا کہ کتابیں لکھے جانے سے پہلے واقعات کو وسعت دے کر باہم سنتے سناتے رہتے تھے۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ واقعات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے تاکہ سننے والا اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے۔ یہ قصے نسلاً بعد نسلٍ زبانی بیان کیے جاتے رہے اور کچھ سے کچھ بن گئے۔ قدیم اقوام کے بہت سے قصے اسی قسم کے ہیں۔ چنانچہ ہومر یونانی کی کتاب ایلیڈ بھی اسی قبیل سے

ہے۔ ہومر تو اس قصے کا صرف راوی ہے۔ اسی طرح بنی شیبان اور کسریٰ کا قصہ ابن نافع تمیمی کی طرف منسوب ہے، کیونکہ وہ اس کا راوی ہے۔ لیکن اہلِ یونان نے اپنے قصوں میں اہلِ عرب کی نسبت زیادہ مبالغے سے کام لیا ہے۔

رومانی قصے

اہلِ عرب نے پاکیزہ عشق و محبت کے ایسے قصے اپنی طرف سے وضع کر لیے جن میں عفت و عصمت اور عشق و محبت میں اپنے آپ کو فنا کر دینے کو امتیازی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ ان قصوں کی بنیاد ان عاشق شعرا کے حالات پر رکھی گئی ہے جو صدرِ اسلام کے زمانے میں موجود تھے مثلاً کثیرؔ اور جمیل وغیرہ۔ انھوں نے عشقیہ قصے لکھے جو عباسی عہد کے آخر تک ایک خاص شکل اختیار کر گئے۔ مثلاً مشہور غزل گو شاعر عمر بن ابی ربیعہ سے متعلق کتاب، اسی طرح ابو العتاہیہ اور عتبہ کا قصہ یا احمد اور دراحہ کا قصہ وغیرہ۔ مشہور عاشق شعرا کے علاوہ بھی محبت کے بعض قصے وضع کیے گئے مثلاً: قصۂ علی ابن ادیم و منہلہ، قصۂ عمرو بن صالح و قصّاف، قصۂ ریحانہ و قرنفل، قصۂ رقیہ و خدیجہ، قصۂ سکینہ و رباب، قصۂ سلمہ و سعادت وغیرہ۔

ابن الندیم نے اور بھی بہت سے قصوں کے علاوہ انسانوں اور جنوں کے باہمی قصوں کے نام بھی لکھے ہیں، جن میں سے اکثر ضائع ہو چکے ہیں اور جو باقی رہ گئے تھے انھیں قصۂ الف لیلۃ و لیلہ میں داخل کر دیا گیا[۲۶]

قصصِ منقولہ

اہلِ عرب نے جو قصے دوسری زبانوں سے عربی میں نقل کیے ان میں زیادہ تر اُن قوموں کے آداب و اخلاق کی جھلک پائی جاتی ہے، جن سے وہ قصے لیے گئے ہیں۔ ایسے قصے زیادہ تر ایران اور ہندوستان کے قصوں سے اخذ کیے گئے ہیں، اس لیے ان میں انھی دونوں قوموں کے آداب و اخلاق نظر آتے ہیں، ان میں سے بعض کا ذکر پہلے گزر چکا

---

[۲۶] الفہرست ص ۴۳۶ - ۴۴۲

ہے۔ ابن الندیم نے اس قسم کے کئی قصوں کے ذکر کے علاوہ بعض یونانی قصوں کا بھی ذکر کیا ہے جو سب کے سب ضائع ہو چکے ہیں۔ اُن میں سے جو قصے ہم تک پہنچے ہیں وہ کتاب الف لیلۃ ولیلہ کے ضمن میں درج کر دیے گئے ہیں[۲۷]

الف لیلۃٍ ولیلہ

یہ چند مسلسل قصوں کا مجموعہ ہے جو کئی ہزار صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ کتاب نہایت مشہور اور عام طور پر شائع ہے۔ کثرتِ مطالعہ کی وجہ سے یہ کئی دفعہ چھپ چکی ہے۔ اس کی اصل اور تاریخ میں اختلاف ہے۔

جرجی زیدان کی رائے میں یہ چند ایسے قصوں کا مجموعہ ہے جو مختلف زبانوں میں جمع ہوئے اور یا اسے جمع کرنے والوں نے خود وضع کر لیے۔ اس کا اصل فارسی نسخہ ہزار افسانہ کے نام سے مشہور ہے اور اسے چوتھی صدی ہجری سے پہلے عربی میں ترجمہ کیا گیا[۲۸]

مؤرخ المسعودی (المتوفی ۳۴۶ھ) نے لکھا ہے کہ "بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ چند ایسے خرافی واقعات کا مجموعہ ہے جن کو بطور داستان سنا کر بادشاہوں کا تقرب حاصل کرنے کی خاطر مختلف لوگوں نے ترتیب دیا۔ جس طرح فارسی، ہندی اور رومی وغیرہ زبانوں کی کتابیں عربی میں نقل اور ترجمہ ہو کر عربی ادب کا حصہ بن گئی ہیں، اس کتاب کی تاریخ بھی ایسی ہی ہے۔ فارسی میں لفظ افسانہ کا اسی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے جس میں عربی لفظِ خرافہ مستعمل ہے۔ عربی میں یہ کتاب الف لیلۃٍ ولیلہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں ایک بادشاہ، اس کے وزیر اور وزیر کی بیٹی اور اس کی لونڈی شہرزاد اور دینارزاد کے متعلق قصے بیان کیے گئے ہیں۔"[۲۹]

اس مقالے کے شروع میں الف لیلۃ ولیلہ کا کچھ ذکر آ چکا ہے۔ ابن الندیم نے اس کی

---

۲۷ نفس المکان

۲۸ جرجی زایدان، تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ۱: ۱۲۹: ۱۳۰

۲۹ المسعودی، مروج الذہب ۲: ۲۵۹ — ۲۶۰

تالیف کا جو سبب بیان کیا ہے اس کا ذکر بھی گزر چکا ہے۔ ابن الندیم نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ کتاب ہمابنت بہمن کی تالیف ہے[۳۰] ابن الندیم نے اس کی تالیف کا جو سبب بیان کیا ہے وہ موجودہ کتاب الف لیلۃ و لیلہ پر پوری طرح منطبق ہوتا ہے[۳۱]

بہر صورت یہ بات صحت کے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے کہ عربوں نے اس کتاب کو چوتھی صدی ہجری سے پہلے فارسی سے عربی میں نقل کیا۔ پھر انھوں نے اس میں اضافہ کرکے کتاب کو وسعت دے دی اور بعض مقامات پر ترمیم و تنسیخ بھی کی، اور اب وہ اپنی آخری شکل میں عام طور پر متداول ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کرنے والوں پر یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ اس میں ایسے قصے بھی پائے جاتے ہیں جن کی طرزِ نگارش، الفاظ اور بعض رسم و رواج کا ذکر اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ اس کے کچھ حصے چوتھی صدی ہجری سے کئی صدیاں بعد میں لکھے گئے۔ مثلاً قہوہ پینے کا رواج، ممالیک حکمرانوں میں سے بعض کا ذکر وغیرہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فارسی سے نقل کرنے والوں نے اصل قصے میں وسعت دینے کی خاطر بہت سے ایسے قصوں اور رسم کا اضافہ کر دیا جو لوگوں میں عام طور پر مشہور تھے۔ اُن میں سے بعض جمع کرنے والوں نے خود وضع کر لیے اور بعض دوسروں سے سن سنا کر اصل کے ساتھ ملا دیے۔

قابلِ ترجیح فیصلہ یہ ہے کہ یہ کتاب اپنی موجودہ صورت میں دسویں صدی ہجری کے بعد اتمام پذیر ہوئی۔ اصل کتاب میں جو اضافے کیے گئے وہ زیادہ تر اہلِ مصر کا کارنامہ ہے اس لیے اگر الف لیلۃ و لیلہ کو اہلِ عرب کی تالیف کہہ دیا جائے تو یہ بے جا نہیں، گو اب بھی اس کتاب میں اصل فارسی کتاب کے بعض قصے موجود ہیں۔

یہ کتاب اپنی موجودہ صورت میں قرونِ وسطیٰ میں اسلامی معاشرے کے آداب و اخلاق کا صحیح نمونہ ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ اس زمانے کے لوگ کس طرح عیش و عشرت اور حظوظِ نفسانی کے پیرو تھے۔ صنفِ نازک کو اس کتاب میں اس طرح پیش کیا گیا ہے

---

۳۰ نفس المکان۔ ۳۱ ایضاً۔

جس سے اس کی کمزوری اور مردوں کی اس کے بارے میں بدظنی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کتاب میں بھوت پریت، عجیب و غریب قسم کی مخلوقات اور انوکھے انوکھے حوادث و واقعات بھی پائے جاتے ہیں جو صرف قوتِ وہمیہ اور تخیّل کا نتیجہ ہیں اور یہ اس زمانے کے لوگوں کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ چونکہ انسان طبعی طور پر مبالغہ آمیزی سے کام لیتا ہے اس لیے یہ کتاب درجہ بدرجہ بدلتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ اپنی موجودہ صورت میں ہم تک پہنچی۔ سندباد بحری کے واقعات اور اس کے متعدد سفروں میں اس کے مشاہدات بہت حیرت انگیز ہیں۔ مثلاً ایسی مچھلیوں کا ذکر جو کئی سو ہاتھ لمبی اور ان میں سے بعض گائے یا گدھے کی شکل پر تھیں۔ اسی طرح اس آبادی کا ذکر جس کے سنگریزے ہیرے کے تھے اور جو سانپوں سے پُر تھی۔ اس میں ایسے سانپوں کا ذکر بھی ہے جو سالم آدمی کو نگل جاتے تھے۔ پھر رُخ پرندے کا ذکر جس کے چھوٹے سے چوزے سے دس سے زیادہ آدمی پیٹ بھر سکتے تھے۔ یہ اور اس قسم کی باتیں جو ہمارے موجودہ معاشرے کے مسلّمہ امور کے خلاف ہیں، اس کتاب میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ لیکن یہ سب باتیں ایک ہی دفعہ اس کتاب کا حصہ نہیں بن گئیں بلکہ اصل قصہ نقل ہوتے ہوتے کچھ سے کچھ بن گیا۔ اس کتاب میں اس طرح مبالغہ آمیزی کی گئی ہے جو حقیقت اور خرافات کے بین بین ہے۔ بہرصورت کتاب نہایت دلچسپ اور دل بہلانے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ ایسی کتابوں کو "کتاب الاساطیر" کہا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا قصوں کے علاوہ چند ایک خرافی قصے بھی ہیں جو عباسی دور کے ختم ہونے سے پہلے وجود میں آئے مثلاً: کتاب حوشب الاسدی، کتاب جحا، نوادرِ ابی ضمضم اور نوادر ابن الموصلی وغیرہ۔

ایک مصری عالم ابوریدہ محمد عبدالہادی نے مستشرق آدم متز کی کتاب کا عربی میں الحضارۃ الاسلامیہ کے نام سے جو ترجمہ کیا ہے اس کے ایک اقتباس کا مفہوم حسب ذیل ہے:

"اس بات کی دلیل کہ مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ اہلِ عرب کے اصلی ادبی ذوق میں کمزوری رونما ہوتی گئی، یہ ہے کہ تیسری صدی ہجری سے غیر عربی قصص و سمر ادبِ عربی کا قائم مقام بنتے

چلے گئے، اس سے پہلے اسرائیلی روایات اور بحری سیاحوں کے قصے دل بہلانے اور اپنے آپ کو مشغول رکھنے کی خاطر سُنے سنائے جاتے تھے۔ لیکن تیسری صدی ہجری سے ہندوستانی اور فارسی قصص کے تراجم عربی زبان میں روشناس ہوگئے، جن میں سب سے اہم الف لیلۃ ولیلہ کی حکایات ہیں جن کا نام ہزار افسانہ تھا۔ حکایات کی تعداد تو دو سَو سے بھی کم ہے لیکن وہ ہزار راتوں پر تقسیم کر دی گئی ہیں۔ یہ حکایات ان عربی ادیبوں کو پسند نہیں آتی تھیں جو فنی اور معیاری نثر پڑھنے کے عادی تھے، وہ اس قسم کے قصص سمر کے بارے میں کہا کرتے تھے۔ "انھا کتابٌ غثٌّ بارد الحدیث"

اس کے بعد مستشرق مذکور لکھتا ہے: "لیکن اس دَور کی ادبی روح جو اصل عربی ذوق کے مخالف تھی اجنبی اقوام سے میل جول کا نتیجہ تھی اور جلد ہی بعض علما اور اچھے اچھے ادیب اسی جدید رنگ میں رنگے گئے اور انھوں نے آسان نثر میں اس قسم کے قصص سمر سے متعلق کتابیں لکھنے میں کوتاہی نہ کی جس سے ان کا مقصد صرف دل بہلانا اور فارغ وقت گزارنا تھا۔ چنانچہ تاریخ الوزراء کے مصنف ابوعبداللہ محمدؒ بن عبدوس الجھشیاری نے الف لیلۃ ولیلہ کی طرز پر ایک کتاب لکھنا شروع کی تھی جس میں اس نے عربوں اور دیگر اقوام کے ایک ہزار قصص سمر جمع کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن وہ ابھی چار سواسیؔ قصص لکھنے پایا تھا کہ اس کا انتقال ہوگیا۔ اس نے ہر قصۂ سمر کو دوسرے قصۂ سمر کے ساتھ ملانے کی بجائے ہر قصے کو علیحدہ علیحدہ رکھا اور اس کی طوالت اتنی ہی رکھی جتنی ایک رات کے لیے کافی تھی۔ اسی قسم کی دل بہلانے والی کتابوں میں سے ایک قاضی ابوعلی الحسن بن علی التنوخی (المتوفی ۳۸۴ھ) نے بھی لکھی جس کا نام نشوار المحاضرۃ ہے اور جس کی آٹھ جلدیں طبع ہو چکی ہیں۔ سب سے آخر میں مشہور مؤرخ مسکویہ (المتوفی تقریباً ۴۲۰ھ) آیا اور اس نے کتاب انس الفرید تالیف کی جو نہایت عمدہ اور چھوٹی چھوٹی حکایات کا اچھا مجموعہ ہے[۳۲]۔

۳۲؎ الحضارۃ الاسلامیہ ۱: ۴۴۸ – ۴۵۰)

"مؤرخ حمزہ بن الحسن الاصفہانی (المتوفی قریبًا ۳۶۰ھ) کی کتاب تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں قصص سمر کی قریبًا ستر کتابیں متداول تھیں جن میں سے بعض ایسے تھے جنھیں ترقی یافتہ طبقے کے لوگوں کے علاوہ وہ لوگ بھی پسند کرتے تھے جو عشق و محبت میں از خود رفتہ ہو جاتے تھے اور وہ آنسو بہانے میں لذت محسوس کرتے تھے اور قبیلہ بنی عذرہ کے متعلق جو روایات کتبِ ادب میں پائی جاتی ہیں وہ جذبۂ محبت کو برداشت نہ کرتے ہوئے جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ یہ روایات طبقۂ عشاق کے جذبات کو اور بھڑکاتی تھیں"[۳۳]

آخر میں اس بات کی طرف اشارہ کرنا بے محل نہ ہوگا کہ کتاب الف لیلۃ و لیلہ کا نام ہی اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ یہ قصّے رات کے وقت سنائے جاتے تھے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ عربوں کے ہاں "سمر" کا رواج بہت عام تھا اور ترقی یافتہ دور اور کتابوں کی تصنیف و تالیف سے پہلے کے زمانے میں بلکہ دورِ جاہلیت میں بھی عرب لوگ رات کو افسانہ گوئی کرتے تھے اور نہ صرف اپنی جنگوں اور قابلِ فخر کارناموں کے واقعات سنتے سناتے تھے بلکہ گزشتہ اقوام یعنی عاد و ثمود اور بنی جرہم یعنی عرب بائدہ اور بنی اسرائیل کی داستانیں بھی آپس میں سنتے سناتے رہتے تھے۔

طاش کبریٰ زادہ نے اپنی کتاب مفتاح السعادۃ میں علم مسامرۃ الملوک کو ایک خاص فن قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ "یہ علم ہے جس میں ان امور پر بحث کی جاتی ہے جن کے ذریعے بادشاہوں کو تاریخی واقعات، قصّوں، وعظ و نصیحت، ضرب الامثال اور مختلف ملکوں اور شہروں کے عجیب و غریب واقعات کی طرف رغبت دلائی جائے، اور اس فن پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً: سلوان المطاع فی عدوان الاتباع جو ابن ظفر کی تالیف ہے۔ اسی طرح مناکتہ الخلفاء، اور کتاب نظم السلوک فی مسامرۃ الملوک وغیرہ"[۳۴]

طاش کبریٰ زادہ نے شیخ ابن العربی کی ایک ایسی ہی کتاب کا ذکر بھی کیا ہے جس کا نام محاضرۃ الابرار و مسامرۃ الاخیار ہے۔[۳۵]

۳۳ھ الحضارۃ الاسلامیہ ۱: ۴۴۸ ۔ ۴۵۰

۳۴ھ مفتاح السعادۃ ۱: ۲۳۲ ۳۵ھ نفس المکان ۱: ۱۸۷

مطالعہ قرآن

مولانا محمد حنیف ندوی

اس کتاب میں مولانا ندوی نے قرآن سے متعلق ان تمام مباحث و مسائل پر محققانہ اظہار خیال کیا ہے۔ جن سے نہ صرف قرآن فہمی میں خصوصیت سے مدد ملتی ہے، بلکہ اس کتاب ہدیٰ کی عظمت بھی نکھر کر فکر و نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ مزید برآں اس سے قرآن کے علوم و معارف اور دعوت و اسلوب کی معجزہ طرازیوں پر بھی تفصیل سے روشنی پڑتی ہے۔ اس کتاب میں مولانا نے زرکشی کی البرہان اور سیوطی کی اتقان کے ان تمام جواہر ریزوں کو اپنے مخصوص شگفتہ اور حکیمانہ انداز میں جمع کر دیا ہے اور مستشرقین کے اُٹھائے ہوئے اعتراضات کا تسلی بخش جواب بھی دیا ہے، جو قلب و ذہن میں شکوک و شبہات اُبھارنے کا موجب ہو سکتے ہیں۔ غرض اسے قرآنی فکر و تصور کے بارے میں ایسا انسائیکلوپیڈیا کہنا چاہیے جس میں وہ ساری بحثیں اور مضامین سمٹ آئے ہیں جن کی دورِ حاضر کو ضرورت ہے۔

صفحات ۸+۳۱۰ قیمت ۲۵ روپے

سطعات: شاہ ولی اللہؒ

ترجمہ: سید محمد متین ہاشمی

حضرت شاہ ولی اللہؒ نہ صرف برصغیر پاک و ہند کی عظیم شخصیت تھے بلکہ اپنے دور میں عالمِ اسلام کی ایک نہایت قابلِ فخر اور بلند مرتبت ہستی تھے۔ وہ بہترین مصلح، بہت بڑے مصنف، اونچے درجے کے عالمِ دین، بے مثال مفسّر، محدّث اور فقیہ تھے۔ ان کی تصنیفات اہلِ علم کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ شاہ صاحب کی گراں قدر تصنیفات میں "سطعات" کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے اُردو ترجمہ کی شدید ضرورت تھی۔ چنانچہ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ یہ سعادت حاصل کر رہا ہے۔

فاضل مترجم نے حلِ طلب مقامات پر حواشی بھی تحریر کیے ہیں، نیز ایک جامع مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے حالات اور ان کی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے۔

صفحات ۱۹۲ قیمت ۱۸ روپے